افسانے

خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے

احمد ندیم قاسمی

www.HallaGulla.com

بہت پیارے

گلزار

کے نام

جو فلمی ہدایت کاری، گیت

نگاری اور مکالمہ نویسی میں غیر

فانی شہرت رکھنے کے علاوہ ایک

بڑے افسانہ نگار بھی ہیں

Virtual Home
for Real People

فہرست

نمبر شمار	نام افسانہ	صفحہ نمبر
ا	خربوزے	3
2	مہنگائی الاؤنس	8

www.HallaGulla.com
Virtual Home for Real People

خربوزے

وہ تھکا ماندہ روتا بسورتا سو گیا۔ سوتے میں اس نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان کے ستارے ہولے ہولے خربوزوں کی شکل اختیار کر رہیہیں۔ اور یہ آسمانی خربوزے جھم جھم کرتے اس کی جھولی میں آ گرتے، خود کٹ جاتے ہیں، بیج خود ہی الگ ہو جاتے ہیں، خود اس کے منہمیں اپنا گودا تراش کر ڈال دیتے ہیں اور چھلکے اچھل کر خود ہی پرے جا گرتے ہیں۔ اور اسکی ماں جس نے شام سے اس وقت تک چیخنے چلانے کے باوجود اس ایک خربوزے کے لئے دو پیسے نہیں دیئے تھے، کواڑ کا سہارا لئے بیٹھی مسکرا رہی ہے اور اس کی ہم جولی پست دیوار پر سے اپنے گرد آلود سر اٹھا کر تعجب اور شک سے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک ایک خربوزہ اس کے سر پر آن گرا۔ اور وہ بلبلا کر اٹھ بیٹھا۔

''ہائے ماں خربوزہ۔''

''تیرے دشمنوں کو موت آئے، تو کیا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ یہا اللہ مارے خربوزے کیا آئے میرے لئے آفت آ گئی۔ چند روز ہوئے تجھے ایک گول گول پیلا پیلا خربوزہ نہیں خرید دیا تھا۔۔۔ سو جا!''

اس نے اندھیرے میں ادھر ادھر آنکھیں جھپکا کر آسمانی خربوزے دیکھنا چاہے مگر بوڑھی بکری کے دھبے اور کبڑے نیم چپ چاپ سائے کے سوا اور اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر اسے خربوزے کا گمان ہو سکتا۔

ساری رات اسے خربوزے بھرے خواب نظر آتے رہے اور جب صبح کو اٹھا تو آنکھیں ملتا اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا اور اس کے اٹھے ہوئے گھٹنے پر اپنی ننھی سی ٹھوڑی رکھ کر مسکین آواز میں بولا۔

''ماں!''

اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ ''کیا۔۔۔؟''

''خربوزہ!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اس کی حقیقی آنکھیں سوتیلی ماؤں کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر ننھے کے گال پر الٹے ہاتھ سے اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر چولہے کے پاس جا گرا۔ زار و قطار روتا وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا اور سوچنے لگا۔ اس دینا میں پہلے سے ہی میرا باپ نہ تھا، اب میری ماں بھی کوئی نہیں۔ میں تو کوئی آوارہ بھکاری چھوکرا ہوں جس گلی میں جاتا ہوں کتے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور جس سے بات کرتا ہوں وہ تیوری چڑھا لیتا ہے۔ بس آج کے بعد گھر نہیں جاؤں گا۔ ان کھیتوں سے نکل کر بہت دور چلا جاؤں گا۔ وہ جہاں اڑتی ہوئی کونجیں چڑیا نظر آ رہی ہیں، جہاں ریلیں اور لاریاں چلتی ہیں۔ بس وہاں۔۔۔ نہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہ کسی کی چوری کروں گا دن کو چلتے چلتے تھک جاوں گا تو شیشموں تلے لیٹ رہوں گا۔۔۔ رات کو تھکوں گا تو نرم گھاس پر سو جاوں گا ماں کہا کرتی ہے کہ ہم سب کو رزق دینے والا اللہ ہے بس اس سے مانگوں گا وہی میرا پیٹ بھر دے گا وہی خربوزے بھی لا دے گا اور خربوزوں کا خیال آتے ہی وہ رک گیا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے اٹھا کر اس نے ہاتھ بند کئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

اے میرے اچھے خدا! میں تجھے یاد کرتا ہوں۔ برسوں مولوی جی سے میں نماز کا سبق بھی لیا تھا اور مجھے کلمہ بھی آتا ہے اور میں بہت اچھا

ہوں۔تو میرے سامنے خربوزے رکھ جا، لے۔۔۔۔۔

اوراس نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کرلیں۔اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔اس کے لبوں کے گوشے کانپنے لگے۔نتھنے پھڑک گئے اوروہ مسکرانے لگا۔اسے محسوس ہوا کہ اللہ میاں اکے لئے خربوزوں کی گٹھڑی باندھے آرہے ہیں۔قدموں کی چاپ نہایت تیزی سے قریب آرہی تھی۔اس کے ذہن پراللہ میاں کا پاکیزہ ہیولی ابھرا۔سفید لباس سفید بال نورانی چہراہ ایک سفید کپڑے میں پیلے پیلے خربوزوں کاایک انبار باندھے وہ اس کے قریب آئے اور پھر۔۔۔اور پھر تڑاخ کی آواز آئی۔اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔اوروہ دھب سے نکیلے پتھروں پر گر گیا۔اس پر سکتہ طاچھا گیا۔پلٹ کر دیکھا تو اللہ میاں کی جگہ سفید لباس پہنے سفید ریش بخشو کھڑا ہانپ رہا تھا۔اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں اور پریشانی میں وہ اپنی ڈاڑھی کو بار بار کھجلاتا تھا۔گرج کر بولا۔شیطان کہیں کا مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ کھڑا ہوگیا جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔یوں کھیت میں گھسا آرہا تھا جیسے اپنے باپ کی ریاست میں اینڈتا پھر رہا ہے۔شیطان کہیں کا، مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ کھڑا ہوگیا جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔یوں کھیت میں گھسا آرہا تھا جیسے اپنے باپ کی ریاست میں اینڈتا پھر رہا۔چیطان کہیں کا۔

ننھا، جوخدااور بخشو کے اس ہولناک تصادم گھبرا سا گیا تھا رونی صورت بنا کر بولا۔

''میں تو خربوزو کی۔۔۔''

اور بخشواس کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔''اور میں کب کہتا ہوں کہ تو یہاں نماز پڑھنے گھر آیا ہے۔خربوزوں کی تلاش ہی تو تجھے یہاں کھینچ لائی۔پچھلے چند سے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے جس نے میرے کھیت کا پوربی گوشہ تباہ کر ڈالا ہے۔اب معلوم ہوا کہ یہ حضرات ہیں''

اوروہ روتا ہوابولا۔ ''میں تو آج ہی۔۔۔''

''اورکل۔۔۔اور پرسوں؟''بخشو نے اپنا سر دائیں اور پھر بائیں کاندھے پر جھکا کر کہا۔''کل پرسوں میں تجھے نہیں دیکھا اس لئے ۔۔۔اٹھ بھاگ یہاں سے۔اگر آج کے بعد تو پھرادھر آیا تو نگل جاؤں گا تجھے۔بڑا آیا خربوزوں کا رسیا۔اتنا شوک ہے تو ماں سے دو پیسے لے خرید لے جا خربوزوں۔''

ننھا اٹھا۔اٹھتے ہوئے اس کی نظریں سامنے سارے کھیت میں گھوم گئیں۔اور بے شمار پیلے پیلے دھبے اس کے سامنے تیرتے ہوئے کھو گئے۔سر جھکائے وہ پلٹا اور بہت دور جا کر ایک ننھی سی بیری کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔اس دنیا میں نہ تو اس کا کوئی باپ ہے اور نہ ماں۔۔۔اور نہ خدا۔۔۔اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ سسکیاں بھرتا ہوا وہیں سو گیا۔

وہ بہت دیر تک خربوزوں بھرے خواب دیکھتا رہا مگر اچانک جیسے اس کے منہ پر اللہ بخش نے تھپڑ مار دیا۔ہڑبڑا کر اٹھا، دیکھا تو ماں کھڑی ہانپ رہی ہے بڑی بڑی لال آنکھیں۔پسینے سے شرابور چہرہ۔پاؤں پر گرد جمی ہوئی۔ہاتھ دوسرے طمانچے کے لئے تلا ہوا۔

''لگاؤں دوسرا؟''وہ بولی''لگاؤں یا گھر چلے گا؟ارے کم بخت تو بخشو کا کھیت اجاڑتا رہا ہے اور پھر بھی ہر وقت خربوزہ کی رٹ

لگائے رکھتا ہے۔ارے چوٹے تجھے شرم نہ آئی۔اللہ بخشے تیرے باپ کو تو ایک روز پانچ کا نوٹ گلی میں پڑا ملا تھا تو بھاگا بھاگا چوپال پر گیا ، پوچھ گچھ کی جس کا نوٹ تھا اسے دے دیا۔ایک کوڑی تک نہیں لی۔گھر لے آتا تو بھیڑ بکری خرید لی جاتی لیکن اس کے من میں کھوٹ نہ تھا۔۔۔اور تو ایسا ناخلف، ایسا کبوت کہ خربوزے چراتا پھر رہا۔زبان کا چسکا پورا کرنے کے لئے خاندان کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے۔بخشوا بھی ابھی میرے ہاں آیا تھا اور اتنی عورتوں کے سامنے میری ناک کاٹ کر وہ پھینکی۔''

''ارے چلتا ہے گھریا۔۔۔'' ماں کا ہاتھ اور بلند ہو کر تن گیا۔انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔وہ اٹھا اور ہولے سے بولا۔

''چلتا ہوں۔''

''چل میرے آگے۔'' ماں نے اس کی گردن کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا۔اور جب وہ بخشو کے کھیت کے قریب سے گزرا تو اس کی آنکھوں کے سامنے پیلے پیلے تارے سے تیرنے لگے جو آہستہ آہستہ رنگ بدلتے گئے اور وہ جب گھر پہنچا تو وہ تارے صحن میں پڑے ہوئے کنکروں میں تبدیل ہو گئے۔

گھر آ کر ماں نے اسے دلاسا دیا۔کھانا کھاتے ہوئے نُون مرچ کے علاوہ اس کے سامنے گڑ بھی تھا۔ماں اسے پنکھا بھی جھلتی رہی اور یہ بھی کہا۔''تو تو میرا سب کچھ ہے۔تو ہی میرا دھن دولت ہے تجھی کے سہارے تو میں جی رہی ہوں۔ورنہ کب کی کسی گھاٹی میں چھلانگ لگا چکی ہوتی۔تو بڑا ہو گا نوکر فوج میں۔''

''میں تھانے میں سپاہی بنوں گا۔'' اس نے لقمہ چباتے ہوئے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

''ہاں ہاں۔'' ماں مسکرا کر بولی۔''میرا ننھا تھانے کا سپاہی بنے گا سر پر لال پگڑی ہاتھ میں ننھی سی چھڑی۔پاؤں میں کالے کالے بوٹ۔جدھر جائے گا لوگ زمین پر بچھتے جائیں گے اور پھر میرا لال چھٹی پر آئے گا تو میرے لئے اچھی اچھی چیزیں لائے گا۔ریشمی کپڑا اور مٹھائیاں اور۔۔۔''

''اور خربوزے بھی۔۔۔!'' اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ماں کے چہرے کی جھریاں گہری ہو گئیں اور پھر وہ بولی۔

''ہاں خربوزے بھی اور۔۔۔''

اور ان باتوں کے دوران میں ننھا سوچتا رہا کہ ماں اس وقت مہربان معلوم ہوتی ہے۔اب میری سچی ماں کے روپ میں ہے۔ کیوں نہ اسے ایک خربوزہ لانے کے لئے کہہ دوں۔لیکن اس کی نظریں اچانک اپنی ماں کے سوکھے ہوئے ہاتھ پر جا پڑیں جس کی انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑی ہوئی تھیں۔تھوک نگل کر چپکا ہو رہا۔

لیکن خربوزوں کا بھوت اس کے سر پر سوار رہا۔کئی بار ارادہ کیا کہ ماں کو ایک خربوزے کے لیے کہہ دے۔پر سوزیلدار جس کے گھر چکی پیس کر ایک آنہ لائی ہے۔کیا ان چار پیسوں میں سے وہ ایک پیسہ کا بھی حق دار نہیں۔آخر اس کا پسا ہوا آٹا اٹھا کر وہی زیلدار جی کی بیٹی کو دے آیا تھا، اور اگر یوں نہیں تو کیوں نہ وہ بخشو والے جھوٹے الزام کو سچ کر دکھائے۔چپکے سے گھس جائے کھیت میں اور اتنے خربوزے

کھائے کہ ساری عمر اسے خربوزوں ہی کی ڈکاریں آتی رہیں۔لیکن یہ سب سوچنے کے بعد اچانک اس کے دماغ میں ماں کا اکڑا ہوا ہاتھ کا بلانے لگا اور اس کے سارے ارادے ننھے ننھے ذرے سے بن کر ہواؤں میں کھو جاتے۔

ایک دن وہ ایک گلی میں خربوزے کے چھلکے دیکھتا گزر رہا تھا کہ اسے زیلدار جی کی آواز سنائی دی۔

''اے ننھے ادھر آ۔''اس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے کئی ہم عمر چوپال پر اکھٹے تھے۔آخر آنکھیں جھپکاتا وہ زیلدار جی کے پلنگ تک گیا اور بولا۔

''جی!''

زیلدار جی بولے۔''ہمارا بھوسا آیا ہوا آج۔اس کوٹھے میں پڑا ہے۔تم سب لڑکے اسے اچھی طرح لتاڑو تاکہ وہ نیچے بیٹھ جائے اور بھوسے کا ایک اور بورا بھی کوٹھے میں آسکے۔دو دو پیسے ملیں گے تم سب کو۔۔۔لتاڑو گئے؟''

''لتاڑوں گا۔''ننھا بولا اور اور ہر طرف خربوزوں کا موسلا دھار مینھ برسنے لگا۔

سب لڑکے اندھیرے کوٹھے میں گھس کر بھوسے پر چڑھ گئے۔بہت دیر تک کودتے ناچتے،گرتے اٹھتے رہے۔بھوسے میں سے مہین دھول نکل کر ان کے بالوں،کانوں،آنکھوں،اور منہ میں گھستی رہی۔مگر دو پیسوں کا جادو انہیں اس شدت سے نچاتا رہا۔کسی کو ریوڑیاں یاد آرہی تھیں تو کسی کو پیپر منٹ،کوئی مصالحہ دار گڑ کے خواب دیکھ رہا تھا تو کوئی رنگ برنگے پتنگوں کے۔لیکن ایک دماغ میں خربوزے لڑھک رہے تھے۔قدموں کی ہر دھمک کے ساتھ کوئی اس کے کان میں کہتا۔''خربوزہ''۔

اور خوش ہو کر جی ہی جی میں کہتا۔''خربوزہ نہیں تو کیا ریوڑیاں؟ دانت ٹوٹ جاتے ہیں چباتے چباتے۔اور پیپر منٹوں سے کچی کچی بدبو آتی ہے اور مصالحہ دار گڑ میں مصالحہ کی جگہ مکوڑے پڑے ہوتے ہیں اور پتنگ ایک جھٹکے سے کٹ جاتے ہیں کم بخت۔ہم تو خربوزہ خریدیں گے باہر پیلا اور اندر سے سفید یا سبز۔ایک ایک پھانک میں لاکھ لاکھ مزے!''

بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا،کودتا رہا،ناچتا رہا۔اور مہیں دھول اس کی آنکھوں اور نتھوں اور گلے میں گھستی رہی اور آخر جب زیلدار جی مطمئن ہو گئے کہ بھوسا اس زیادہ نہ دب سکے گا تو سب ننھے بھتنوں کی طرح باہر نکلے،دو دو پیسے سب کی ہتھیلیوں پر رکھے جانے لگے۔ننھا سب سے آخر میں تھا۔وہ جونہی ہاتھ پھلائے زیلدار جی کے قریب آیا اور انہوں نے جیب سے ہاتھ نکالا تو وہ مٹھی بند کر کے کلیلیں بھرتا چوپال سے بھاگ نکلا۔

''ارے ننھے پیسے تو لیتا جا۔''زیلدار جی ہنستے ہوئے بولے۔اس نے رک کر مٹھی کھولی تو خالی تھی۔ اسے زیلدار جی بڑے سست اور نالائق معلوم ہونے لگے۔جنہوں نے دو پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھنے میں تین گھنٹے لگا دیئے تھے۔

واپس آکر اس نے زیلدار جی سے پیسے لئے مگر اس کا ہاتھ کانپ گیا اور پیسے نیچے گھوڑے کی لید میں گر گئے۔نہایت پھرتی سے اس نے لید سے پیسے اٹھائے اور ڈھلوان پر سے لڑھکتے ہوئے کھلونے کی طرح خربوزوں والے شامو کی دکان کی طرف لپکا۔

دور سے شامو کو پکارا۔''چچا شاموں ایک خربوزہ،دو پیسے کا ایک اچھا سا،بڑا سا پیلا سا خربوزہ!''

اور جب وہ چچا شاموں کے قریب پہنچا تو خربوزہ منتخب ہو چکا تھا۔ دو پیسے شاموں کے آگے پھینک کر وہ خربوزے کے کو بغل میں دبائے گھر کی طرف دوڑا۔ ایک جگہ اس نے ٹھوکر بھی کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ حلق پر جمی ہوئی دھول تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے ''چیں چاں'' بجنے لگی۔ گھر کے صحن میں قدم دھرتے ہی پکارا۔

''ماں۔۔۔خربوزہ۔۔۔!'' اور اس حلق فرط مسرت سے گھٹ گیا۔ ''خربوزہ۔۔۔!'' وہ ایک بار پھر چلایا۔

اندر سے آواز آئی۔

''پھر وہی خربوزہ۔۔۔؟ تیرا باپ دے گیا ہے مجھے خربوزے کہ تو۔۔۔ارے خربوزہ۔۔۔''

اور ماں نے بڑھ کر خربوزہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گھمایا۔

''کہاں سے لایا۔۔۔''!

ننھے نے جب ماں کو سارا حال سنایا تو وہ بولی۔

''پیسے گھر لے آتا تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلتا۔۔۔مگر خیر، تجھے شوق تھا۔۔۔شکر ہے تیرے من کی آگ ٹھنڈی ہوئی ۔۔۔لے زری چھری اٹھالا۔۔۔چولہے کے پاس پڑی ہوگی۔''

ننھا کودتا پھاندتا چولہے کے پاس گیا۔ چھری کے دھوکے میں دست پناہ اٹھالایا۔ رستے میں پلٹ کر دست پناہ وہ پھینکا اور چھری اٹھالی۔ ماں کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چھری خربوزے پر جھکی اور اس کی نوک خربوزے کے کلیجے میں داخل ہونے لگی تو ماں بولی۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' اور جی ہی جی میں ننھے نے تین بار بسم اللہ شریف پڑھی۔۔۔اور پھر۔۔۔!

پھر دونوں ٹکڑے الگ ہو گئے اور پانی کی ایک ندی سی فرش پر بہنے لگی۔ بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا سارا گودا پانی بن چکا تھا۔ اور بیج کالے رنگ کے ہو گئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے۔ خربوزے کو فرش پر پٹخ کر ماں نے انگلیوں کی پانچ سلاخوں سے ننھے گال اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ لڑھکتا لڑھکتا دیوار کے قریب ہی جا رکا۔ چھلکے بوڑھی بکری نے بھی نہ قبول کئے۔

وہ روتا بلکتا سو گیا۔ اور جب صبح کو اٹھا تو اس کے گلے میں ''چیں چاں'' سی ہو رہی تھی اور اس کے بدن سے آگ کے شولے اٹھ رہے تھے۔

اور چھلکے سے کالے کالے لمبنگے چیونٹے چمٹ رہے تھے اور بخشو کے کھیت میں۔۔۔ہر طرف پیلے پیلے دھبے سے ناچنے لگے۔ وہ چیخ مار کر تڑپا اور کھٹولے سے نیچے آ رہا

the end of the lesson date -6-07-005

مہنگائی الاؤنس

ادھر لالہ مراری لال نے ہیڈ کلرک کا عہدہ سنبھالا، ادھر ان کے مزاج کا ایک چھلکا اتر اگیا۔ ہر وقت ہنستے، مسکراتے، گپیں ہانکتے لالہ مراری لال نے قلابازی کھائی کہ دفتر والے دم بخود رہ گئے۔ اب لالہ جی بات بات پر میز پر گھونسا جماتے، عینک کو ناک سے بانسے تک سرکا کر اور بھوؤں کو ماتھے کی لیکروں میں پھنسا کر کلرکوں کو گھورتے ہر چپراسی کو الو کا پٹھا کہہ کر پکارتے، بازار سے گزرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے بدہضمی کے مریض ہیں۔ کوئی دکان دار سلام کرتا تو سر کو خفیف سی جنبش دے کر جواب دیتے۔

''ہوں''۔۔۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ''تجھے کس نے کہا تھا سلام کرنے کو۔۔۔!'' لیکن جونہی گھر میں قدم رکھتے اور کسم چوکے میں بیٹھا دیکھتے تو ان کا سارا نشہ جھاگ کی طرح فش فش بیٹھ جاتا اور وہ بھولپن سے کہتے ''بیٹھی ہو کسم؟''

کسم ابھی تک اپنے اور اپنے پتی کے سن میں بیس برس کی طویل مسافت نہیں کاٹی تھی۔ اس نے اس صحرا کا تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا۔ اس لئے بجائے اس کے کہ مسکراتی ہوا ٹھتی اور آرام کرسی پر بھکرے ہوئے لالہ جی کی گدگدی پنڈلیوں سہلاتی الٹی پلٹتی۔ انگارے پر انگارا دھرتی۔ ہنڈیا کے پیندے پر جمی ہوئی تہیں کھرچتی اور آنکھوں میں رس اور باہوں میں مَس تمنائیں گھول کر تکان کی نامکمل انگڑائی لیتی اور پھر سینے پر اٹکے ہوئے دوپٹے کو مبہم سے جھٹکے سے گرا کر کہتی۔

''جی بیٹھی ہوں، آپ کہیں تو بیٹھ جاؤں۔''

''واہ۔۔۔!'' لالہ مراری لال کان سے میل نکال کر چھنگلیا کو آرام کرسی کے میلے ٹاٹ پر مل دیتے۔ ''میں تو چاہتا ہوں اں تم بیٹھی ہی رہو۔''

کسم کے گالوں پر گلاب کھل جاتے۔ لہجے میں لچک اور آواز میں جھجک پیدا کر کے کہتی ''یعنی لولی لخی ہو کر رہ جاؤں؟''

لالہ جی تالی بجا کر ہنستے۔ الگنی سے لٹکے ہوئے پنجرے میں خواب دیکھتا ہوا طوطا چونک کر کہتا۔

''وارے نیارے، وارے نیارے!''

اور پاجامے پر دھوتی باندھ کر نیچے سے پاجامے کو سرکاتے ہوئے کہتے۔ ''کیسے پیار بول سکھا دیئے طوطے کو۔ تمہارے آنے سے پہلے جانتی ہو کیا بکتا رہتا تھا۔۔۔ کہتا تھا۔۔۔۔

''مرجا مار دے۔۔۔ مرجا مار دے۔''

''لیکن اب تو پچھلے چند دنوں سے کوی بن رہا ہے کم بخت۔۔۔'' کچھ سوچ کر کہتے ''کسم! تم میرے ساتھ ''واک'' پر چلا کرو''

''جی معاف کیجیے۔'' کسم دسپنہ سے پٹاخے چھوڑنے لگتی۔ ''آپ جایا کیجیے واک پر میرے نصیبوں میں تو اس ہرے ہرے کوی مہاراج کی کوتیا سننا ہی لکھا ہے۔''

اچانک باہر سے لالہ امیر چند کی آواز آئی۔

''چلو واک پر چلے مراری۔''

اور لالہ مراری لال شش سالہ گرگابی میں ایک چیتھڑا رکھتے ہوئے جواب دیتے۔ ''دو ویٹ کرنا امیر چند! کم بخت پمپ شو میں ایک کیل ابھر آی ہے۔'' پھر ہولے سے کسم کو چھیڑتے۔ ''اندر چلی آئیں امیر چند؟''

''جی معاف کیجئے!'' کسم لالہ جی کو پمپ شو سے لے کر کنپٹیوں کے سفید بالوں تک دیکھتی۔ ''وہ اتنے بڑے ہو کر بھی مذاق سے باز نہیں آتے۔''

''مجھ سے تو چھوٹے ہیں۔'' لالہ مرالال گرگابی میں پاؤں یا پاؤں میں گرگابی گھسیڑتے ہوئے کہتے۔

''ابھی پچھلے دنوں ہی میری ایڑیوں پر ہاتھی دانت کی گیندوں کی پھبتی کسی۔ اس کے بعد وہ کشتی والی پھبتی تو آپ کو نہیں بھولی ہوگی۔ سن نہیں دیکھتے اپنا۔ آنکھوں کے کناروں پر مکڑیاں ٹانگیاں پسارے پڑیں ہیں۔ اور چلے ہیں چھیڑ چھیاڑ کرنے پرائی بہو بیٹیوں سے۔''

لالہ جی کسم کے گالوں پر جوانی کے گلابوں کے علاوہ غصے کے شعلے دیکھتے تو لہجے میں گھی مکھن ملا کر کہتے۔

''وہ میرے متر ہیں کسم، اور پھر پڑوسی ہیں۔ ان کے بارے میں ایسی بات نا کیا کرو۔ یہ کیا کم ہے کہ جب سے تم نے تیوری چڑھائی ہے میں انہیں اندر نہیں آنے دیتا۔ وہ خدا اندر نہیں آتے، کہتے ہیں ''کوی ناگ رانی کی تصویر کھینچنا چاہے، تو کسم بھابی کو ماڈل بنا لے۔''

کسم تڑپ اٹھی۔''

''لاج نہیں آتی آپ کو؟''

لالہ مراری مسکرا کر چھڑی سنبھالتے اور چوکے کی حد پر رک کر کہتے۔

''اچھا تو اسی وقت پر لوٹیں گے ہم۔۔۔ بھوجن تیار ہوگا نا؟''۔۔۔ اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ڈیوڑھی کی طرف پلٹتے اور کہتے۔

''آج ویدر بھی فائن ہے امیر چند! آج تو بہت لمبی واک کو جی چاہتا ہے۔''

اور جب لالہ جی چلے جاتے تو کسم کی رگوں میں جھنجھناہٹیں پیدا ہو جاتیں آنگن کی ویرانی گول مول پر چھائیوں سے بھر جاتی۔ ڈیوڑھی کا ادھ کھلا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگتا۔ اور لالہ امیر چند کے بالا خانے سے ان کی لڑکی کے دھیرے دھیرے گانے کی آواز آتی۔ یہ الاپیں اس کے کانوں کے قریب کوئی کوئی آسیبی رقص کرتی۔ وہ ہنڈیا کے ڈھکنے کو کھسکا کر بڑبڑاتے ہوئے آلوؤں کو چمچے سے الٹتی پلٹتی۔ رکی ہوئی بھاپ راستہ پا کر ابھرتی۔ اور کسم کے گرد و پیش کو نم آلود کرتی ہوئی تحلیل ہو جاتی۔ اٹھ کر وہ طوطے کچوکوں سے اکساتی۔ وہ اپنے پروں کو پھیلا کر اور چونچ کھول کر چلاتا۔

''وارے نیارے۔۔۔ وارے نیارے۔''

''رام رام کر!'' کسم سلاخوں پر دسپنہ بجا کر کہتی۔

''رام نام کے جاپ میں مکتی ہے۔ نگوڑے، بول رام رام۔''

''وارے نیارے!'' طوطا سلاخوں سے چمٹ کر بلبلاتا۔

''رام رام!''

''وارے نیارے!''

اور وہ انگلیوں کی گلابی پوروں کو سہلا کر سوچتی۔

''تو بکواسی ہے جانے کون سی گھڑی تھی کہ تجھے یہ بول سکھا دیئے یہاں وارے نیارے نہیں ہوتے یہاں لمبی لمبی واکیں ہوتی ہیں اس راکھشش امیر چند کے ساتھ جو ہنستا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بڑا سا پھوڑا پھس گیا ہو

جب لالہ مراری نے پہلی پتنی کے سوگ سے فارغ ہو کر کسم کے معاملے میں سلسلہ شروع کیا تو ان کی ہیڈ کلرک کی سفارش ہو چکی تھی۔ یہی سفارش دراصل اس بیاہ کی سفارش ثابت ہوئی۔ اور پھر لالہ جی سارے شہر میں اپنی زندہ دلی کے لیے مشہور تھے۔ ان کے قہقہوں کی فلک شگافی ضرب المثل بن چکی تھی۔ چٹکلے سن کر یا سنا کر سامنے پڑی ہوئی میز پر اس زور سے گھونسا جماتے کہ سوڈا واٹر کی بوتلیں جلترنگ بجانے لگتیں۔ اور شیشے کے گلاس لڑھک جاتے۔ جوانی کا عمر سے تو کوئی لاؤ ہی نہیں۔ یہ تو مزاج کی گھلاوٹ سے عبارت ہے۔ اور لالہ مراری لال کے مزاج میں تو پھلجھڑیاں اور پھول گھلے ملے تھے۔ پہلی پتنی سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وہ کبھی اداس نہ دیکھے گئے تھے۔ کہتے تھے ''جب ایشور دے گا۔ تو ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور دھم سے آجائے گا ٹھن متھنا سا نولا سلونا بچہ۔۔۔۔ آخر اس میں فکر کی کون سی بات ہے۔!''

کسم کے پتا نے لالہ مراری لال کے سن کے مدنظر ایک مرتبہ اعتراض کیا تو تھا مگر کسم کی ماتا بھڑک اٹھی تھی۔ ''واہ! میں نے جب بھی دیکھا ہے مراری کو یوں لگتا ہے، جیسے آپ ہی گھومتے پھر رہے ہیں۔!''

کسم کے پتا کو اپنی مونچھوں میں کہیں کہیں سفید تاروں کا احساس تھا مگر وہ اس غیر محسوس عذر گناہ کا کوئی روپیش نہ کر سکے۔ اور اپنی چھڑی کو بے تابانہ گھماتے خاموش ہو رہے۔''

کسم نے بھی اندر ہی اندر کئی بل کھائے تھے۔ بیماری کا بہانہ کیا تھا اور پھر سچ مچ بیمار بھی ہو گئی تھی ماتا کو کئی بار چپ چاپ اشارے کیے۔ میلے لباسوں، بکھرے بالوں اور مری مری مسکراہٹوں کے کئی تیر چھوڑے، مگر وہاں لالہ مراری لال کے سر پر متوقع ہیڈ کلرکی کا مکٹ ان کے چہرے پر بچپنے کی معصومیت برسا رہا تھا۔ کسم کو کونین کھلائی گئی۔ جوشاندے پلائے گئے۔ اسے ایک مہانتری کی اشیرواد بھی ملی۔ اور جب بندھن کی تاریخ قریب آ گئی تو کسم نے سوچا۔ کیوں نہ بھری برادری میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں اور چیخ چیخ کر کہہ دوں کہ ''نہیں کرتی شادی میں۔ ایشور کی بھگتی کروں گی۔ میں دیوداسی بنوں گی۔ مجھے مکتی چاہیئے۔۔۔!'' مگر یہ الفاظ اس کی ان نبضوں ہی میں دھڑکتے رہ گئے۔ جو نگوڑیاں عجیب عجیب مقامات پر ابھر آتی تھیں۔ آخر نچلے ہونٹ کے خم اور رکانوں کی لوؤں اور انگلیوں کے پوروں میں نبضوں کا کیا گزر۔ مگر وہ تو کئی مرتبہ ایک اچھا خاصا ساز بن جاتی تھیں۔ جس کے ہر تار پر کسی ان جانے مضراب کی چوٹ پڑتی رہتی تھی۔

دن تو خیر عورتوں کا تانتا بندھا رہتا۔

البتہ رات کو وہ اپنے خیالوں کی محفل سجاتی۔

لالہ مراری کتنے نئے نئے اور انوکھے روپوں میں آتے۔مگر اچانک ان کے چہرے پر ایک استخوانی ہاتھ جالی سی کاڑھنے لگتا۔اور کسم کروٹ بدل کر نئے خیالوں کو بلا لیتی۔اس نے کئی ایسے ارادے بھی کئے۔جو کمرے کی کھڑکیوں سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ویران سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے آوارہ نوجوانوں کے گائے ہوئے فلمی گیت اس کے دل پر دستک دیتے وہ کمرے میں گھومنے لگتی۔کھڑکی کے قریب جا کر سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے کا روشن تاج دیکھتی۔جس کے اردگرد پتنگوں کا ایک ہجوم ایک اٹوٹ دائرہ بنائے رکھتا۔اچانک اس قمقمے سے لالہ مراری لال چھڑی سنبھالے نکلتے اور کسم لپک کر اپنے پلنگ پر آ گرتی۔گٹھڑی بن کر گر پڑتی۔گھٹنوں کو سینے سے بھینچتی اور جب ساتھ کے کمرے میں اس کے پتا کھانستے، باہر سڑک پر نیپالی چوکیدار نیند کی مستی کے عالم میں لوگوں کو ہوشیار رہنے کے لئے کہتا۔اور روشندان میں سویا ہوا کبوتر خواب میں گٹکتا تو کسم کا ماحول سانس لینے لگتا۔خیالوں کے پتنگے اندھیرے کونوں سے چمٹ جاتے۔ایک لمحے کے لئے وہ اپنے آپ کو اس قربانی کے لئے تیار پاتی۔مگر اچانک رات کا سکوت دبے پاؤں آتا اور اس کے کانوں کے قریب سرگوشی کرتا۔

''اب کیا ہوگا؟''

آخری روز وہ دن بھر روتی رہی۔اس کی ماتا کو کچھ شبہ سا ضرور ہوا کیوں کہ سوچ کی سنجیدگی نے اس کے چہرے کی جھریوں کو گہرا کر دیا تھا۔مگر اب سوچ بچار کا وقت کہاں تھا۔اب تو گھرانے کی ناک کی فکر تھی جو کٹنے کے لئے ذرا سا بہانہ چاہتی ہے۔

لالہ مراری لال کے ہاں آ کر کسم نے دیکھا کہ لالہ جی کچھ ایسے بھیانک نہیں۔چہرہ سرخ ہے۔اگر اس سرخی میں کہیں کسی جھری نے جھالر بنا دی ہے۔تو کیا۔جھری آخر انسانوں ہی کے چہرے پر پڑتی ہے نا۔اور پھر لالہ جی کے مزاج کی رنگینی تو کسم کے مرجھائے ہوئے خیالوں کے لئے ساون کی پھوار ثابت ہوئی۔چند راتیں تو اس نے رنگ رنگ کی خیالی بہشتیں بسانے میں بسر کیں۔پھر کچھ راتیں چھت کی کڑیاں اور چلمن کی تیلیاں گنتی رہی۔ایک دو مرتبہ نصف شب کی خاموشی میں کسی بھجن کے ابتدائی بول بھی گنگنائے،مگر اس کے کمرے کی ویرانی میں کوئی فرق نہ آیا۔

نشت و برخاست میں نئے نئے زاویئے اختیار کئے، چلتے ہوئے یوں لچکی جیسے کہیں سے ٹوٹ جائے گی۔سانس لینے میں بھی ایک ادا تھی۔نازک نتھنے یوں پھڑکتے جیسے کسی آوارہ بوند کے گرنے سے پھول کی پتی ہلکی سی پھریری لیتی ہے۔سینہ یوں ابھرتا جیسے ابھرتا ہی چلا جائے گا اور جب یہ سیلاب اترتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے ساری کائنات کہیں دور خلا میں ڈوبی جا رہی ہے۔آنکھیں جھپکانے سے پہلے پتلیوں میں نیندیں جھانکتیں اور جھپک کے بعد یہ نیندیں پھیل کر چھپ جاتیں۔جیسے جھاگ کے ہٹ جانے سے سمندر کی تہہ میں پڑی ہوئی سیپی جھلک اٹھتی ہے۔انگڑائی یوں لیتی جیسے فضا میں ابھر کر تیرنے لگے گی۔اور پھر ایک دم باہوں کو یوں چھوڑ دیتی۔جیسے دو ستارے ایک وقت میں متوازی خطوط بناتے ٹوٹ پڑیں۔

اگر لالہ مراری لال کی ماتا زندہ ہوتیں تو شائد کسم کو رسم و رواج کی بہت سی سولیوں پر لٹکنا پڑتا۔مگر یہاں تو بالکل میدان تھا۔اور کھلے میدانوں میں اگر ہرنی کسی ٹیلے کے اوٹ میں پڑی رہے تو لعنت ہے اس کے ہرنی ہونے پر اور تف ہے اس کی ان کلیلوں پر جن میں

جوانی ہے۔رقص ہے،آہنگ ہے،دعوت ہے،وہ دعوت جوفوری پذیرائی چاہتی ہے،چاہے یہ پذیرائی شکاری کے تیر کی ہو،صیاد کے دام کی ہو یا ہرن کے اضطراب کی!

لیکن یہاں تو ابتدائی دنو میں چند مسکراہٹوں کا سودا ہوا۔اور لالہ مراری لال کی چھٹی ختم ہوگئی۔اسی پر کار کا چکر شروع ہوگیا جو ہر کلرک کی زندگی کا محور ہے۔دفتر سے گھر،گھر سے واک پر۔۔۔اور واک سے واپسی پر فائلوں بھری نیندیں اگر مراری لال جی کسم کو دفتر کی اس گھنٹی کی حیثیت ہی دے دیتے جس کی گردن کو دبا کر اردلی کو بلایا جاتا ہے تو بھی غنیمت تھا۔لیکن کسم بے چاری تو یہاں آتے ہی ردی کی ٹوکری بن گئی۔ہر وقت قدموں میں پڑی رہتی۔گاہے گاہے چند مٹی مٹی مسکراہٹیں،چند گھسے پٹے قہقہے۔چند مڑی تڑی باتیں۔بے رس جمائیوں کی دھجیاں اور بس!

اور پھر لالہ مراری لال ہیڈ کلرک بن گئے تو اچانک ان کے مزاج کا ایک چھلکا اتر گیا۔خوش مزاجی سانپ کی کینچلی کی طرح اتر گئی۔اب لالہ مراری لال دفتر کے فرعون تھے۔ظاہری آن بان میں بھی تبدیلی نمایاں ہوگئی۔جھکی ہوئی مونچھوں نے ننھی سی انگڑائیاں لیں۔داڑھی ہفتے میں دو مرتبہ کی بجائے بلاناغہ صاف کی جانے لگی۔گول پگڑی میں ننھی سی کلغی بھی ابھر آئی۔کسم کی امید بندھی۔پھر وہی خیالی جنتیں بسنے لگیں۔لیکن ان جنتوں میں کوئی نہ آیا۔لالہ مراری لال دفتر سے آکر کسم کے سامنے بالکل سیدھے سادھے مراری لال بن کر رہ جاتے۔

کسم نے جب دیکھا کہ گھسی ہوئی چول ہے۔کھاٹ کو مقررہ زاویئے پر جمانا ہوگا تو چول کی درزیں بھرنے لگیں۔ایک بار لالہ جی کے بوٹ اتارتے ہوئے ان کی پنڈلی کے بال کھینچ لئے۔مگر مراری لال ہڑبڑا کر پیچھے ہٹے تو آرام کرسی کا ٹاٹ دھڑ سے پھٹ گیا اور لالہ جی قلابازی کھا گئے۔اٹھے تو گردن کے تناؤ میں دیر تک جھول سی پڑی رہی۔کسم اپنے تجربے کا یہ بھونڈا نتیجہ دیکھ کر چکرا گئی تھی۔مگر لالہ جی کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ دیکھ کر ہنس دی۔

لالہ جی بولے۔

''میں سمجھا بھڑ ہے۔ٹخنوں میں جا گرا تھا کلیجہ!''

''بڑی کھلی سڑکیں ہیں آپ کے جسم میں!'' کسم نے فقرہ کسا۔

لالہ جی کوئی مناسب جواب نہ پا کر یوں بولے جیسے حلق میں چھپی ہوئی سوئیاں نکال رہے ہیں۔

''بات یہ ہے کسم کہ میں دو مہینے سے ایک پیٹنٹ دوا استعمال کر رہا ہوں۔اسی لئے تو سبزی کے سوا کچھ نہیں کھاتا۔پرہیز ضروری ہے۔اور پھر یہ تم جانتی ہوگی کہ پرہیز کمزور کر دیتا ہے۔''

اچانک حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی اور لالہ امیر چند چند دستک کے جواب کا انتظار کئے بغیر اندر گھسے چلے آئے۔وہ اس سے پہلے بھی یونہی اندر آتے رہتے تھے۔اور جس روز انہوں نے ننگے پاؤں پھرتی ہوئی کسم کی ایڑیوں پر ہاتھی دانت کے گیندوں کی پھبتی کسی تھی تو کسم نے ان کی آنکھوں میں کئی زبانوں کو تڑپتے دیکھ لیا تھا۔اسی لئے لالہ امیر چند اسے اچھے نہیں لگتے۔آج جب انہوں نے دیکھا

کہ کرسی ٹاٹ زمین پر پڑا ہے۔ لالہ جی کی گردن میں خم اور پیٹھ پر گرد ہے تو کسم کے ہونٹوں پر شرارت کی تھرتھری ہے تو وہ ایک دم زور سے ہنسے تالی بجا کر بولے۔

''کشتی ہو رہی ہے۔ پتی پتنی کی!''

لالہ مراری لال کی مسکراہٹ مزید شہ دی۔ اب امیر چند نے کسم کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔

''کسم نے پٹخنی دی ہے شائد!''

۔۔۔۔۔۔۔۔اور کسم اندر بھاگ گئی۔ ایک کونے میں سمٹ کر پڑ رہی۔ بھلا یہ کوئی بات ہے جو حق دار ہے وہ پرہیز کی وجہ سے چھوئے تک نہیں اور جو تماشائی ہے وہ دونوں ہاتھوں سے ہڑپ کرنے پر تل جائے۔ لالہ مراری لال اندر آئے کسم کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر رکے۔ تیوری چڑھا کر دہلیز پر ٹھٹکے ہوئے امیر چند کی آنکھوں میں دے ماری۔ اور کسم سے بولے۔

''آخر ایسا بھی کیا۔۔۔۔''

امیر چند پلٹ گئے تو کسم سسکیاں بھرنے لگی۔

''لالہ امیر چند یہاں نہ آیا کریں۔۔۔بس۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔ابھی پچھلے دنوں مجھ پر پھبتی کسی تھی۔ آج آ کر لتے لے ڈالے میری لجا کے۔۔۔۔دوست ہیں تو پڑے ہوا کریں۔۔۔ہاں!''

اور لالہ مراری چپکے سے باہر کھسک آئے۔ امیر چند سے کھسر پھسر کی۔ اس کے شانے کو تھپتھپایا، ہاتھ جوڑے اور اس کے بعد لالہ امیر چند اندر کبھی نہ آئے۔ بس باہر ہی سے پکار دیتے۔''مراری چلو واک پر چلیں۔''اور پھر ایک دو باریوں کھانستے جیسے حلق سے چمٹے ہوئے تنکے کو اچٹنا چاہتے ہوں۔

کسم اکثر سوچتی کہ مراری لال کو محض بھوجن تیار کرنے والی کی ضرورت تھی تو ان گنت نوکرانیاں مل سکتی ہیں۔ آخر کسم کو بندھن میں جکڑ کر اس سے محض روٹی پکوانے کا کام لینا تو سفا کی ہے۔ شادی بیاہ کے بعد کی باتوں پر اسے کافی عبور حاصل تھا۔ کیونکہ اس کی کئی سکھیاں اس کے سامنے ہی بیاہی گئی تھیں۔ اور پھر انہوں نے کسم کو بتایا تھا کہ کنوار پنے کی جوانی تو تالاب کے پانی پر کائی کی حیثیت رکھتی ہے۔ کنول تو جا کر کھلتے ہیں پتی کے گھر میں۔ وہ کنول جو کبھی نہیں مرجھاتے۔ یہاں کسم بڑے بڑے کنولوں کی امیدیں لے کر آئی تھی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ تالاب کا پانی ہی سوکھ چکا ہے۔ موئے کنول اگیں گے۔ تو اسے ہر طرف تھوہر کے ظالم کانٹوں کا احساس ہونے لگا۔ ان کانٹوں سے بچ کر نکل جانے کی اس نے کئی ترکیبیں سوچیں۔ رامائن کو رٹ ڈالا چند بوڑھی پڑوسنوں سے ہمالہ کی چوٹیوں پر بسنے والے بیراگیوں کی کہانیاں سنیں۔ جنہوں نے جوانیوں کو تج کر برف سے آگ سینکی اور آگ سے امرت نکالا۔ لالہ امیر چند کی بیٹی ہیم لتا سے اس کا بہنا پا سا ہو گیا۔ اور جب اس نے یہ سنا کہ ہیم لتا کی ماں کب کی سورگباش ہو چکی ہے تو اس کے دل میں لالہ امیر چند سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

''لتا۔۔۔عمر کیا ہے تمہارے پتا کی؟''ایک دن پوچھ بیٹھی۔

چ کر بولی۔

''دکھوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔ ورنہ عمر تو یہی کوئی بیالیس چوالیس کے لگ بھگ ہوگی!''

کسم بولی۔''عمر تو کچھ زیادہ نہیں۔''

اور طوطا پنجرے کی ایک سلاخ کو چونچ سے کھرچ کر بولا۔

''وارے نیارے، وارے نیارے۔''

لتا ہنس پڑی۔

اور کسم آنکھیں جھپکانے لگی۔

لالہ مراری لال کچھ اداس اداس رہنے لگے۔ کیونکہ لالہ امیر چند اب واک پر نہیں جاتے تھے اور اکیلے واک پر جانا کچھ ایسا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ناچتے پھرنا۔ پچھلے چند دنوں سے لالہ امیر چند کو روحانی تھکن کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اور چونکہ لالہ مراری لال کو اس مرض کا خاصہ تجربہ تھا اور وہ خود ایک برس سے پیٹنٹ دوائیں استعمال کر رہے تھے۔ اس لئے کئی مفید مشورے دیئے اور کہا۔

''ایک بار استعمال کرو اور پھر دیکھو کیسے اینٹھن سی ہوتی ہے رگوں میں۔ پر ہاں زیادہ خوراک نہ لینا۔ رات کو نیند نہیں آئے گی۔ بوتل پر سب ہدایات لکھی ہوئی ہیں۔ کہو تو لیتا آؤں؟''

اور لالہ امیر چند جواب دیتے۔

''دیکھیں گے۔ ابھی تو سانند وید کی ایک دوا استعمال کر رہا ہوں جو بندھیا چل کی جڑی بوٹیوں کے ست سے تیار ہوئی ہے۔۔۔۔''

لالہ مراری لال کو واک پر جانے کے لئے ساتھی کی ضرورت تھی اور وہ انہیں لالہ امیر چند کے بوڑھے بہنوئی کی کی صورت میں مل گیا۔ اس کا نام اوی ناش تھا۔ وہ ایک عرصے سے ہردوا میں مقیم تھے۔ ان کا اصلی نام رام دیا تھا۔ مگر ہردوار والواں نے کہا کہ اس نام میں پنجابیت ہے، اس لئے اسے بدل دینا چاہئے۔ وہ یہاں تین مہینے کی چھٹی پر آئے تھے۔ چھٹی لے کر پہاڑوں پر جانا تو ناممکن ہو گیا تھا۔ اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جب چھٹی کا مقصد اچھی صحت حاصل کرنا ہے۔ اور یہ صحت پہاڑوں کی پاکیزہ ہواؤں کے علاوہ مفت کی پر تکلف دعوتوں میں بھی مل سکتی ہے تو اتنے اسراف سے فائدہ! ہواؤں سے پھیپھڑے بھرے جاتے ہیں دعوتوں سے توندیں ٹھونسی جاتی ہیں۔ اور پیٹ بہر حال پھیپھڑوں سے زیادہ توجہ کے لائق ہے وہ بلا کے چٹورے واقع ہوئے تھے۔ ہیم لتا بے چاری ہر وقت رسوئی میں پڑی رہتی اور پھوپھا کی خاطر مدارت میں کوئی فرق نہ آنے دیتی۔ اول تو اسے خود بھی پھوپھا س انس تھا۔ کیونکہ وہ اس کے لیے ہردوار سے قسم قسم کے تحفے لائے تھے۔ دوسرے لالہ امیر چند کی سخت تاکید تھی کہ ہیم لتا باہر نہ جائے۔ حتیٰ کہ کسم کے ہاں بھی کم جائے۔ مبادا لالہ اوی ناش بے توجہی کا گلہ کر بیٹھیں اور ناک کٹ کر وہ جا گرے۔

لالہ مراری لال دفتر سے آتے۔ کسم سے دو چار باتیں کرتے اور پھر اوی ناش کو ہمراہ لے کر واک پر نکل جاتے۔ لالہ امیر چند نے

لتا کچھ سودکان کو اپنے نائب کے حوالے کر دیا تھا۔ سارا دن کھاٹ پر پڑے رہتے۔ پانچ بجے کے بعد چھت پر چلے جاتے اور دیر تک وہیں ٹہلتے رہتے۔ ہیم لتا نیچے رسوئی میں شام کا کھانا تیار کرتی رہتی۔ اندھیری شاموں کو جب لالہ جی چھت سے اترتے تو اگرچہ ان کے مزاج تھکن بدستور رہوتی۔ مگر انکے چہرے میں سرخی سی ضرور جھلکتی، جسے ہیم لتا نے بلندی کی صاف ہوا کا اثر سمجھا تھا اور دوپہر سے ہی ہیم لتا جی سے جھگڑا شروع کر دیتی۔

''آپ چھت پر جایئے نا، جب تک دھوپ ہے، برساتی پلنگ پر پڑے رہتے ہیں۔ شائد مجھے آپ کے قدموں کی چاپ تو سنائی نہیں دیتی۔ چھت کی ہوا سے آپ کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑا ہے۔''

لالہ اوی ناش اور مراری لال واک پر واپس آتے، تو دیر تک گپیں ہانکی جاتیں اور پھر لالہ مراری لال گھر جاتے ہوئے امیر چند کو نئی نئی دواؤں کے نام بتاتے۔ گھر آ کر وہ ایک چکر میں پڑ جاتے انہیں کسم کی چہلیں پسند تو تھیں۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر چہلوں کا طوفان ایک دم سے کیسے ابل پڑا۔ اب نہ لالہ جی کے بوٹ اتارتی نہ ان سے کوئی مذاق کرتی۔ نہ ان کی پنڈلیوں سے بال کھینچتی۔ اپنے پلنگ پر پڑی گنگناتی رہتی۔

''سکھی پی کا ملن کیسے ہوئی ری!''

اور جب وہ یہ بول گاتی:۔

چوریاں پھوروں مانگ بکھیروں

کجرا ڈاروں دھوئی ری!

سکھی پی کا ملن کیسے ہوئی ری!

تو لالہ جی پکار اٹھتے۔

''کسم!''

کسم محض گردن موڑ کر پوچھتی۔

''جی!''

''ایسے بھجن نہ گایا کرو!''

''یہ بھجن نہیں گیت ہے۔''

''ایسے گیت نہ گایا کرو۔''

''کیوں جی!''

''جو بول بار بار منہ سے نکلیں وہ پورے ہو کے رہتے ہیں۔''

اور کسم زور زور سے ہنستی۔

''آ عجیب بھولی باتیں کرتے ہیں، آپ تو بلکل بچے ہیں!''

لالہ جی کی عجیب گھبراہٹ اور حیرت دیکھ کر وہ انگڑائی لے کر اٹھتی! پاؤں لٹکا کر دیر تک ٹانگیں ہلاتی رہتی۔ سلیپر پہن کر سہج سہج قدم اٹھاتی اور کافی دیر کے بعد لالہ جی کے سامنے ایک تھال آتا۔

لالہ جی سوچتے اور کھاتے، کھاتے اور سوچتے۔ اور چونکہ ویدوں کے قول کے مطابق کھاتے ہوئے سو جائے تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اس لئے لالہ جی کا معدہ بھاری رہنے لگا۔ اور اس کا ایک ہی علاج تجویز ہوا۔۔۔۔ واکیں اور لمبی کر دی گئیں۔

اوی ناش نے نہایت تندہی سے لالہ مراری لال کا ساتھ دیا۔ اتنی لمبی واکیں ہوئیں کہ موٹروں والے بھی ہار جائیں۔ لالہ امیر چند چھت پر ٹہلتے رہتے۔ ہیم لیتا کو رسوئی نے باندھا رکھا تھا۔ وہ بے چاری دن ڈھلے کسم کے ہاں چلی جاتی۔ دونو طوطے کو چھڑتیں۔ لالہ اوی ناش کی ننھی سی تو وند پر نئی نئی پھبتیاں سوچی جاتیں۔ لالہ امیر چند کے عجیب و غریب مرض کے متعلق فکر کا اظہار کیا جاتا اور ہیم لتا کہتی۔۔۔۔!

''کسم سچ کہتا ہے تیرا طوطا۔ تیرے تو وارے نیارے ہیں تو جس ڈھنگ سے جیون بتا رہی ہے وہ میرے لیکھ میں ہو تو بھگوان جو کہے کرنے پر تیار ہوں۔ تو دن بھر آرام سے کھاٹ پر پڑی رہتی ہے لالہ جی کے لئے دو پھلکے تیار کر لئے۔ کوئی سبزی بھون کر رکھ لی اور بس! مجھے دیکھ رسوئی میں پڑی سڑتی ہوں۔ ادھر پتا جی کی چنتا کھائے جا رہی ہے۔ جانے کیا ہو گیا ہے انہیں۔ گھر سے نکلتے ہوئے تو کہتی ہوں ''ہے ایشور، انہیں تانگے موٹر کی چھت سے بچائیو۔ پہلے چھت پر جاتے تھے۔ اب باہر گلیوں میں بھی گومتے رہتے ہیں۔ آخر بیچارے کیا کرے۔ واک کی پرانی عادت ہے نا''

اور جب لالہ اوی ناش کی تین مہینے کی چھٹی ختم ہو گی اور وہ ہردوار چلے گئے تو لالہ مراری نے لالہ امیر چند سے کہا۔

''ارے بھئی رہنے بھی دو، میں تو کہتا ہوں تم جوانی میں بھی لال سرخ نہ ہو گئے جتنے آج کل ہو، یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے تم نے۔ چلو میرے ساتھ، واک کرے گیں، تو اور نکھرے گی تمہاری صحت۔۔۔۔''

بڑی ردو کد کے بعد لالہ امیر چند رضامند ہوئے، اور اب پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب وہ دروازے تک آ کر پکارتے ''چلو واک پر چلے مراری۔۔۔۔'' تو کبھی کبھی لالہ مراری لال کسم سے پوچھتے۔

''کسم! ضد کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ لالہ امیر چند میرے اتنے اچھے متر ہیں اور یوں باہر سے صدائیں لگاتے پھریں۔ کوئی دیکھنے تو کیا کہے۔ کیا حرج ہے اگر وہ آ جایا کریں اندر!''

''نہیں جی!'' کسم کہتی۔

''کیوں؟''

''بس!''

''آخری کوئی وجہ؟''

''بس۔۔۔ ہم نہیں چاہتے۔۔۔۔ ہاں!'' اور پھر نچلا بھرا بھرا ہونٹ لٹکا کر کہتی ''ہماری مرضی۔''

یہ بہاری کے آغاز کی بات ہے۔لالہ اوی ناش کو ہردوار گئے کوئی سات آٹھ مہینے گزرے ہو گئے، لالہ مراری لال کی زندگی اسی محور پر گھوم رہی تھی کہ ایک بوڑھی پڑوسن کی زبانی یہ سن کر بھونچکا سے رہ گئے کہ کسم کی گود ہری ہونے والی ہے۔

بہاری کی ابتداء گھسے پھٹے بچے کھچے ارمانوں میں بھی ایک اضطراب سا بھر دیتی ہے۔اور پھر لالہ مراری لال تو ایک مدت سے پینٹ دوائیں استعمال کر رہے تھے۔وہ منتظر تھے کہ بہار جب شباب پر آئے تو پتنی کے تمام حقوق کی نگرانی شروع کر دیں گے مگر اب تو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا تھا۔شادی کے بعد کا سوال نئے نئے رنگوں میں ان کے سامنے آیا۔مگر یہ ہمیشہ کی طرح ہموار تھا۔کہیں کہیں کسم کے غیر معمولی ناز اور غمزے اس خط مستقیم میں مخنی سی دھڑکنیں پیدا کر دیتے تھے، ورنہ کوئی فکر کی بات نہ تھی وہ سوچنے لگے کہ اگر پتنی کو مخنی سی دھڑکنیں پیدا کر دیتے تھے، ورنہ کوئی فکر کی بات نہ تھی وہ سوچنے لگے کہا اگر پتنی کو محض چھو لینے سے اس کی گود ہری ہو جاتی ہے، تو جنگ کے زمانے میں جرمنی اور اٹلی کی دواؤں پر اتنے اسراف کی ضرورت تھی۔وہ کسم کے بارے میں گھنٹوں سوچتے رہے۔اس روز کسم کو بڑے غور سے دیکھا مگر اس کے چہرے پر خوف و ہراس یا ندامت کا ہلکا سا عکس بھی نہ تھا۔وہ سوچتے کہ شائد بھولے سے۔۔۔کبھی کسی بھیگی رات کے سناٹے میں۔۔۔!مگر یہ ناممکن تھا۔۔۔انہیں اپنی یادداشت پر ناز تھا۔ہیڈ کلرک بننے میں ان کی زبردست یادداشت کا بھی بہت کچھ دخل تھا۔اور پھر اس نوع کے واقعات تو ان کے ذہن میں پوری جزوی تفصیلات کے ساتھ محفوظ رہتے تھے کیونکہ آخر مستقبل کی تاریخ انہی واقعات سے تو مرتب ہوا کرتی ہے۔

چند روز کے بعد دفتر میں ان کی میز پر فائیلوں کا ایک انبار سا لگ گیا۔ماتھے کی ہڈی ہر وقت تپی ہوئی ٹھیکری بنی رہتی۔ضروری کاغذ پھٹ جاتا۔چٹھی کو نئے سرے سے ٹائپ کرانے کے لئے کلرک کو بلاتے تو کہتے۔

''زرا کھلا کھلا ٹائپ کرو، کاغذ ضائع ہوتا ہے تو ہونے دو، ہمیں کس کی پرواہ نہیں وہ جانتے تھے کہ شادی کے بعد بچے پیدا ہوتے ہیں۔شادی اکثر اسی غرض سے کی جاتی ہے۔بچے کی پیدائش بیاہ ہے جوڑے کی سب سے بڑی کامیابی اور مسرت ہے لیکن محل نظر تو یہ بات تھی کہ لالہ مراری لال کے پرہیز کی مدت ابھی ختم ہی نہیں ہوئی تھی، اور بچہ آپ ہی آپ نکلا۔

اندیشوں کا ایک طوفان تھا جو ان کے دماغ میں نت نئے دھماکے پیدا کرتا۔کئی بار تو وہ اس حد تک سوچتے کہ بچے کو مار دینے کی تجویزوں پر غور کرنے لگتے۔مگر پھر جی میں کہتے شُبہے کی گنجائش ہی نہیں، شادی کے بعد ایسا ہوتا ہی ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں، یہ سوال بھی زرا لمبی مدت ہے اس سے پہلے ہو جانا چاہئے تھا یہ واقعہ۔۔۔مگر واقعہ تھا بڑا ٹیڑھا۔

وہ کسم یا کم از کم امیر چند سے اپنی اس فکر کا ذکر کرنے کے لئے بے قرار ہو جاتے۔لیکن کسم سے بات کرتے جھجکتے مبادا وہ شور مچا دے اور اچھا بھلا بچہ پرایا ہو کر رہ جاتے۔جوانی میں انہوں نے کوک شاستر پڑھا تھا۔وہ یہی کہتا تھا کہ عورت سے سوچ سمجھ کر بات کرو ورنہ وہ نہ بگڑ گئی تو سنبھالے نہ سنبھلے گی۔

لالہ امیر چند سے اس کا ذکر اس لئے نہ کرتے کہ وہ فوراً ایک عظیم الشان فیسٹ کا مطالبہ کریں گے۔۔۔ان کے لئے تو تعجب کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔

اور پھر ایک روز کسی بے تار برقی کے زریعے کسم کی ماتا آنکلیں، اور پڑوسنوں کا تانا بانا بندھ گیا۔

''آپ آج چٹھیلے لیجئے۔''

کسم کی ماتا نے کسی مصلحت کی وجہ سے کہا تھا۔ اور سوچنے لگے تھے۔

''آخر کسی کا نوکر تھوڑا ہوں، کسم نے مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ سارا معاملہ خود بخود نمٹائے جاتی ہے، اگر ایسی ہی غیرت ہے تو مجھے کیا پروا۔ میں دفتر جاؤں گا۔ اور وہ سچ مچ دفتر چلے گئے۔

مگر ابھی چار بجنے میں نو منٹ باقی تھے کہ ان کے کمرے کے باہر ایک شور سا بلند ہوا، اور پھر لالہ امیر چند کی آواز آئی۔

نکلو بھئی دفتر سے، سامنے آؤ اور فیسٹ کی رقم سیدھے ہاتھ سے رکھ دو۔''

ان کے احباب کا انبوہ کمرے میں گھس آیا۔

کلرکوں کی شریر مسکراہٹیں کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر چمٹی ہوئی تھیں۔ اور سارے دفتر میں ایک گونج سی چکر کاٹ رہی تھی۔

لالہ امیر چند آگے بڑھ کر بولے۔

''اچھا تو آپ اپنے کارنامے چھپائے رکھتے ہیں ہم سے۔''

لالہ مراری لال نے سوچا، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب جی برا کرنے سے فائدہ! سنبھل کر بات کرو۔۔۔ مسکراؤ۔۔۔ یہ بھگوان کی دین ہے، قبول کرو اسے شاباش!

ضمیر کی چٹکیوں سے بے پروا ہو کر انہوں نے کہا۔

''ایسی باتوں کے اشتہار تو لگائے نہیں جاتے۔''

لالہ مراری لال نے مسکرا کر کہا۔

''ہوگی اور دھڑلے سے ہوگی۔۔۔!''

اور پھر دفتر سے نکل کر انہوں نے گھر کی راہ لی۔ سارے احباب ہمراہ تھے۔ راستے میں لالہ مراری لال نے ایک راز کا انکشاف کیا

''فیسٹے مجھے پہلے بھی کوئی انکار نہ تھا۔ مگر اب تو ہمیں مہنگائی الاؤنس ملا کرے گا۔ پچھلے چھ مہینوں کا الاؤنس بھی اب کے اکٹھا مل جائے گا۔۔۔ فکر کی بات نہیں۔''

حویلی کے دروازے پر لالہ امیر چند بولے۔

''سنا ہے بھابی بچے کا نام خود ہی چنے گی۔ کسی پنڈت تونڈت کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، سنا ہے کبیر چند نام ہوگا ہمارے بھتیجے کا، مگر مراری! یہ کبیر تو کوئی عربی لفظ معلوم ہوتا ہے۔''

کواڑ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے لالہ جی بھوری مونچھوں میں سے بولے۔

''تو بھئی یہ امیر ہماری بھاشا ہی کا لفظ ہوگا۔ ہے نا۔۔۔ یہ بھی تو مسلمانوں ہی کی گھڑنت ہے۔''

اور مراری لال نے سوچنے لگے!

آخر بچے کا نام گردھاری لال یا سرداری لال کیوں نہ ہو، گردھاری یا سرداری اور مراری۔۔۔اور یہ کبیر اور۔۔۔۔:

انہوں نے گھبرا کر سامنے دیکھا اور اچانک اندر سے طوطا پکارا۔

''وارے نیارے، وارے نیارے!''

www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People